# میری نانی امّاں

بنت سید وقار الحسن

۱۳/اپریل۲۰۱۲ء نانی اماں کا یومِ وفات ہے۔ ان کو ہم سے بچھڑے ہوئے پورا ایک سال ہونے کو ہے۔ سال بھر میں اُن کے حوالے سے کچھ لکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ان کی عظیم المرتبت شخصیت کے سامنے اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا شدید احساس ہونے لگتا۔ پھر واقعہ یہ ہے کہ میں ذہنی طور پر اُن کی جدائی کے سانحۂ فاجعہ کو ابھی تک قبول نہیں کر پائی۔ میں یہ تصور نہیں کرنا چاہتی کہ میں اُن کا شفیق لمس اب کبھی محسوس نہیں کر پاؤں گی۔ بھلا میں یہ کیسے سوچ لوں کہ اُن کی سراپا مودت ذات کی ٹھنڈک اب کبھی میرے اندر نہیں اُترے گی؟ میں تو اب تک گھر میں داخل ہوکر سلام کے جواب کے انتظار میں اُن کے خالی بستر کو اُمید سے دیکھتی ہوں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی کی تو بات ہے کہ نانی اماں نے خواب میں مجھ سے باتیں کیں۔ میں صبح کو اُن کی چارپائی کے سرہانے کھڑی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح مجھے فوراً اپنے ساتھ چمٹا لیں گی لیکن......

اگست ۱۹۹۶ء میں والد صاحب نے ہم دونوں یعنی مجھے اور بھائی جان کو حصولِ تعلیم کے لیے خیر پور سے ملتان نانی اماں کے پاس بھیج دیا۔ نانی اماں کے گھر آ کر محبتوں اور قربتوں کے جس جہان سے میں روشناس ہوئی اس نے یوں اپنی گرفت میں لیا کہ قدم یہیں جم کر رہ گئے۔ اس طرح مجھے نانی اماں سے رشتہ داری کے علاوہ اُن کے ساتھ رہنے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور یوں مسلسل اُن کی محبتیں سمیٹنے اور دعاؤں سے مستفیض ہونے کا عادی بن جانے کے بعد اُن کی جدائی کا صدمہ سہنا مزید کربناک ہے۔

دل کے تسلیم نہ کرنے کے باوجود حقائق کا بہرحال اپنا ایک جہان ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اُن کے چلے جانے سے کبھی نہ پُر ہونے والے دو خلا پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک جذباتی اور دوسرا روحانی۔ جذباتی تو یوں کہ اُن کے بعد سب اُدھورا ہے۔ میرے لیے تو کامیابی کی تکمیل تبھی ہوتی تھی جب سب سے پہلے نانی اماں کو آ کر بتایا جائے کیونکہ ان کی بے پناہ حوصلہ افزائی، بے شمار دعائیں اور والہانہ پیار ہی سے خوشی کو اس کا حقیقی مفہوم ملتا تھا۔ اور روحانی خلا یوں کہ نانی اماں کے انتقال سے جو بابِ دعا بند ہوا ہے اس کی اشد ضرورت اور شدید کمی ہر کام میں، ہر وقت اور ہر جگہ محسوس ہوتی رہتی ہے۔ اُن کے مقدس وجود کی سب برکتیں اُن کے ساتھ چلی گئیں۔ اُن کی حیات میں روحانی طور پر حفاظت کا حصار اپنے گرد محسوس ہوتا تھا اس کی جگہ اب ایک مہیب سناٹا ہے۔ ان کے روشن باطن کے وہ سعد اثرات جو واضح طور پر ماحول کو منوّر کرتے تھے اب اُن کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔

یوں تو جدوجہد انسانی زندگی کا لازمہ ہے۔ جب تک سانسوں کا تسلسل باقی ہے کسی نہ کسی مقصد کے حصول کے لیے کوشش بھی جاری رہتی ہے۔ لیکن جو چیز زندگی کو قیمتی، سودمند اور کامیاب بناتی ہے وہ ایسا مقصد ہے جو عنداللہ مقبول ہو اور جس کے لیے کی جانے والی کوشش کا ہر لحہ باعثِ اجر وثواب ہو۔ اور میری نانی امّاں ہر لحہ، ہر آن اعلائے کلمۃ اللہ کے عظیم الشان مقصد کی تکمیل کے لیے پوری محویت سے کوشاں رہیں۔ میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہتی ہوں کہ وہ دین کے معاملے میں ''**لا یخافون لومۃ لائم**'' کا عملی نمونہ تھیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ جس قدر دلیری اور ایمانی قوت سے وہ سرانجام دیتی تھیں اس کی مثال کم از کم اس دورِ تنزل میں بہت ہی مشکل ہے۔ اس دورِ جدید میں رہتے ہوئے خوب و زِشت کے بدلتے ہوئے پیمانے اور ''روشن خیالوں'' کی خود ساختہ مصلحتیں کبھی ان کو حق بات کہنے سے نہ روک سکیں۔ اس حوالے سے سنتوں کے احیا کا خوب اہتمام کرتیں۔ ہمارے گھر آنے والی خواتین میں سے اگر کوئی ملاقات کے بعد واپسی پر ''خدا حافظ'' کہہ دیتی تو اس کو واپس بلا کر سمجھاتیں کہ ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ'' ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے اور ''خدا حافظ'' ہماری ذاتی اختراع ہے۔ ایک تو ''السلام علیکم'' کا دعائیہ مفہوم ''خدا حافظ'' کے مقابلے میں وسیع تر ہے دوسرے یہ سنت بھی ہے۔ اور یہ محض ایک دو دفعہ ہو جانے والا اتفاق نہیں ہے لگا تار پندرہ برس تک اُن کے اس معمول کی میں عینی شاہد ہوں۔ جب کبھی کسی نے ''السلام علیکم'' کی سنت کو ترک کیا، اُنہوں نے ہمیشہ اپنا فرض ادا کر دیا قطعِ نظر اس بات سے کہ مخاطب کا تعلق کس طبقے اور قبیلے سے ہے۔

ان کی ذات میں وسعتِ نظری اور دینی حمیّت کا مثالی اجتماع تھا۔ مثلاً ہمیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے کبھی نہیں روکا مگر ساتھ ہی اس بات کو قلب و روح میں اتار دیا کہ انگریزی زبان سرمایۂ افتخار نہیں بلکہ محض وقت کی ضرورت ہے۔ میں نے انگریزی میں ایم۔اے کیا تو میری کامیابی پر مجھے بہت پیار کیا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ پھر حسبِ معمول فوراً مجھے کہا ''اب ماں سے میری بات کراؤ'' اور امّی جان کو خود میرا نتیجہ سنایا۔ البتہ ایک مسلمان کا انگریزی زبان وتہذیب سے مرعوب ہونا یا گفتگو میں انگریزی الفاظ کا بے ضرورت استعمال کرنا اُن کی دینی حمیّت کو کسی طور گوارا نہ ہوتا۔ وہ اس بات پر گہرے دکھ اور غم کا اظہار کرتیں کہ من حیث القوم ہماری ذہنی غلامی ہمیں اس نہج پر لے آئی ہے۔ آخر کو یہ اُن کا ورثہ بھی تو تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک مردِ حُر اور بطلِ جلیل حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی دختر ہونے کا اعزاز بخشا تھا۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن میری بہن (ماموں زاد) نے مدرسے سے آ کر کہا:

''امّی جی پیسے دے دیں۔ باجی (استانی) نے کہا ہے Paper money لے کر آؤ۔''

نانی امّاں یہ سنتے ہی ایک دم برہم ہو کر کہنے لگیں کہ Paper money کہے بغیر کیا گزارہ نہیں ہوتا۔ پھر فوراً ایک پرچی لکھ کر بڑی خالہ جان (مدرسے کی صدر معلّمہ) کو بھجوائی۔ اس پر لکھا تھا:

''لعنت بر پدرِ فرنگ۔ کیا اب جامعہ بستانِ عائشہؓ کی طالبات ومعلمات بھی Paper money ہی بولا کریں گی؟ پرچوں کے پیسے کہنے سے بھی مفہوم تو ادا ہوسکتا ہے۔''

پھر وہ پرچی سب معلمات نے فرداً فرداً پڑھی اور بہت ممنون ہوئیں۔ نانی امّاں کی تبحّر علمی اور زبان دانی کا یہ عالم تھا کہ ان کی زندگی میں کبھی اردو یا فارسی کی لغت کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ امیر شریعت رحمہ اللہ جیسے خطیبِ اعظم کی دختر ہونے کی حیثیت سے اردو اور فارسی پر اُن کا عبور تو شاید محلِ تعجب نہ ہو دل چسپ بات یہ ہے کہ انگریزی میں بھی کچھ کم مہارت نہ تھی۔ ایک دن مسکراتے ہوئے مجھے کہنے لگیں: ''بیٹا میں تمہارے سامنے انگریزی عبارت پڑھتی ہوں بھلا سنو تو یونہی ہے نا؟'' یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں انگریزی میں ایم۔اے کر رہی تھی۔ جب اُنہوں نے عبارت پڑھی تو بے ساختہ میں نے کہا:

''نانی امّاں جی! آپ کے سامنے تو میرا ایم۔اے بھی شرمندہ ہے۔''

حالانکہ انہوں نے باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی تھیں۔

میری نانی امّاں اپنی اولاد کو واقعی آنکھوں کی ٹھنڈک سمجھتی تھیں۔ ہم سب کو اکٹھا کر کے اُن کی خوشی دیدنی ہوتی۔ میری امّی جان اور چھوٹے ماموں (ذوالکفل بخاری علیہ الرحمۃ) سے دور ہونے کی وجہ سے بہت اداس ہوتیں۔ آخری چند سالوں میں امّی کو بہت اصرار سے کہتیں کہ جلدی جلدی ملنے آیا کرو۔ ماموں جان جب تک سعودیہ میں مقیم رہے اپنی ممتا سے مجبور ہو کر بہت بے قرار ہوتیں۔ بہت زیادہ یاد کرتیں لیکن جب ماموں جان کا انتقال ہوا تو نانی امّاں نے مثالی صبر اور حوصلے کا مظاہرہ کیا۔ فطری محبت تو ویسی ہی تھی لیکن اب ان کا تذکرہ کرنے کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ ان کو یاد کرتے ہوئے اس طرح بے چین نہیں ہوتی تھیں۔ ان کی بلند بختی پر شکر ادا کرتی تھیں۔ رضا بقضا اور رب کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرنا اسی کو کہتے ہیں۔

موت کا ہمہ وقت استحضار اور تیاری کی فکر اُن کی زندگی کا ایک اور قابلِ تقلید پہلو ہے۔ موت کا استحضار ان کے تمام تفکرات و ہموم پر حاوی اور تمام ترجیحات پر غالب تھا۔ تیاری کا انداز زاہدانہ نہیں محبانہ تھا یعنی عبادت کی ادائیگی محض فرض سمجھ کر نہیں بلکہ پوری محبت اور اخلاص سے کرتیں۔ ویسے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اُن کے ماسوا سے زیادہ محبوب رکھنا ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے لیکن ایمان کے درجے متفاوت ہوتے ہیں۔ رضا بر قضا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے خود رفتگی کی حد تک عقیدت و محبت اُن کے ایمان کی پختگی اور بلندی کے دو بڑے مظاہر تھے۔

وہ ''محمد بگوئید و مستی کنند'' کے معانی و مفاہیم سے بخوبی آگاہ تھیں۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتیں۔ کوئی عمرہ یا حج پر جانے سے پہلے ملنے کے لیے آتا تو رندھی ہوئی آواز میں ہمیشہ یہی

مخصوص جملہ کہتیں:

''روضۂ اقدس پر حاضری ہو تو میرا سلام عرض کر دینا۔ کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ غلام کی بیٹی سلام عرض کرتی تھی۔''

ان کی زندگی کے آخری لمحات ویسے ہی لائق صد رشک تھے جیسے سب اہلِ دل کے ہوا کرتے ہیں۔ نزع کے عالم میں جب تک بولنے کی سکت باقی رہی اللہ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی کا اقرار کرتی رہیں، پھر خود بخود رُخ قبلے کی طرف ہو گیا اور اللہ اللہ کہتے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو گئیں۔ نانی اماں نے ہر ہر قدم پر صلاح وفلاح کے لیے ہماری رہنمائی کی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ جاتے جاتے بھی سمجھا گئیں کہ

دیکھو　دنیا　ہے　دل　ہے
اپنی　اپنی　منزل　ہے

نانی اماں کی وفات سے تقریباً ایک ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ میں مدرسے سے کوئی کتاب اُٹھانے کے لیے گھر آئی۔ کتاب لے کر واپس جانے کے لیے مڑی تو کہنے لگیں:

''ابھی آئی بھی اور جا بھی رہی ہو، میں نے بتایا کہ کتاب لینے آئی تھی تو اُنہوں نے محبت سے لبریز لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا، ایک میں تمہاری نانی اور ایک تم میری نواسی، تھوڑی دیر میرے پاس ہی بیٹھ جایا کرو، پھر خود ہی ہنس پڑیں اور کہنے لگیں اچھا بھئی جاؤ۔''

میرا دل چاہتا ہے میں کسی طرح اپنی اکلوتی نانی اماں کو بتاؤں کہ اُن کی اکلوتی نواسی ابھی تک ان کے چلے جانے کا یقین نہیں کرنا چاہتی۔ اُن کی اکلوتی نواسی کو اب کوئی یہ نہیں کہتا کہ ''تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ جایا کرو۔'' عطاء المکرم ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ ''مجھے گزرتے ہوئے لگا کہ مجھے دادی اماں نے آواز دی ہے۔ میں نے مُڑ کر پیچھے دیکھا''...... وہ کہتا ہے ''امّی مجھے پتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ دادی اماں واپس آئیں لیکن میں نے سوچا شاید''......

میرا دل چاہتا ہے میں نانی اماں کو بتاؤں کہ میں اور ۸ سالہ عطاء المکرّم بالکل ایک ہی بات سوچتے ہیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں نانی اماں کو بتاؤں کہ میرے یہ شکستہ الفاظ اُن کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی ایک حقیر سی کوشش ہیں ورنہ آنسو بھی بھلا کبھی الفاظ میں ڈھل سکتے ہیں؟